# ڈاکٹر خضر یسین کی ہرمینیات: ایک جائزہ

از: عبدالباسط پتافی

کسی بھی صاحبِ فکر کے خاص نظریے یا مخصوص فکری پہلو کا جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس مفکراوراس کی مجموعی فکر کاایک اجمالی تعارف پیش کیاجائے۔تاہم فی الحال ہمارامقصدان کی شخصیت اور مکمل فکری نظام کااحاطہ نہیں اور نہ ہی ایسا مختصر احاطہ ہماری تحریر کو مختصر مضمون رہنے دے گاالبتہ دو نکتے ذہن نشین رہنے چاہئیں:

**ایک** یہ کہ ڈاکٹر خضر یسین علم بالوحی اورانسانی علوم میں واضح تفریق کے قائل ہیں یہاں تک کہ اگر عقل کی مدد (حکم بناتے ہوئے) سے قرآن سے نکات و مطالب برآمد کیے جائیں تو وہ عقل کی رو سے کتنے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں انہیں علم بالوحی ہر گز نہیں کہا جاسکتا۔

**دوسرا** یہ کہ وہ نبی پر ایمان کو غیر مشروط قرار دیتے ہیں پس عقل یا کسی اور ذریعہ کو حاکم بنا کر ایمان کا فیصلہ نہیں کیاجاسکتا۔رقمطراز ہیں:

"ایمان بالغیب انسان کاارادی فیصلہ ہے جو نبی ص کے بیان کو غیر مشروط طور پر قبول کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔"(ص175)

ان کی فکر کے ان دو بنیادی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر آئندہ پیش ہونے والے نکات کی اہمیت اور گہرائی بہتر طور پر سمجھی جاسکتی ہے۔

---

ہرمینیات (Hermeneutics) کو ہم تین بنیادی ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

1۔کلاسیکی ہرمینیات (Classical Hermeneutics)

اس میں متن کے ساتھ اس کے ماتن و مصنف کو جوڑا جاتا ہے اور اصل یہ قرار دی جاتی کہ انسان مصنف کی مراد سمجھتا ہے البتہ کبھی کبھار غلط فہمی کا امکان بھی موجود رہتا ہے۔اور ہرمینیات کا کام ہوتا ہے کہ متن میں موجود غموض، تعقید اور ابہام کو واضح کرے اور ان کو حل کرنے کے قواعد دے تاکہ غلط فہمی سے بچا جا سکے۔

اس پر اسلامی دنیا میں بہت اور گونا گوں انداز میں کام ہوا ہے۔پس اس دور کی خصوصیات یہ ہیں

الف) متن ایک وسیلہ ہے

ب) قاری کو مصنف کی مراد تک پہنچنا ہوتا ہے

ج) اصل غلط فہمی کا نہ ہونا ہے

د)ان کا زیادہ تر کام مقدس متون پر مشتمل ہے

2۔جدید ہرمینیات (Modern Hermeneutics)

یہ شکل بھی کلاسیکی ہرمینیات کی طرح متن کو وسیلہ مانتی ہے اور اس سے مصنف کی مراد تک پہنچنا چاہتی ہے مگر محض متن کے قواعد تک رسائی حاصل کرنا درست نہیں سمجھتی بلکہ مصنف کے تاریخی اور نفسیاتی سیاق کا بھی ادراک کرنا ہوگا اور قاری بھی ایک فعال کردار ادا کرتا ہے۔انہوں نے تشریح و تفہیم کا دائرہ متون مقدسہ سے بڑا کر دیا اور تمام انسانی متون کو اس کے تحت لے آئے۔

اس دور کی خصوصیات درج ذیل ہیں

الف) متن وسیلہ ہے

ب) مقصد مصنف کی مراد تک پہنچنا ہے

ج) قاری ایک فعال کردار عطا کرتا ہے

د) متن کوئی جامد شے نہیں اور نہ قواعد کافی بلکہ مصنف کے نفسیاتی و تاریخی پس منظر کو جاننا ضروری ہے

ھ) تفہیم و تشریح کا دائرہ مقدس متون سے بڑھا کر تمام انسانی متون تک لے جایا گیا

و) بعض نے متون سے بڑھ کر انسانی علوم کو بھی شامل کر لیا

ز) اس صورت میں اصل "غلط فہمی اور سوئے فہم" ہے۔

3۔ فلسفیانہ ہرمینیات (Philosophical Hermeneutics)

یہ سابقہ دونوں شکلوں پر سوال اٹھاتے ہوئے پوچھتی ہے کہ "فہم" کیا ہے؟ یعنی یہ جو ہم متون اور مصنف کی مراد کو سمجھنے کے درپے ہیں، پہلے یہ تو طے ہو کہ سمجھنا یا فہم (Understanding) کیا ہے؟ اور ہم کسی چیز کو سمجھتے کیسے ہیں؟ پس فلسفیانہ ہرمینیات نے متن سے قاری کا واسطہ جوڑا اور مصنف کی حیثیت معدوم کر دی (یا شاید مصنف برائے نام رہ گیا)

---

اس بنیادی تعارف کے بعد ہم چند اہم نکات لکھتے ہیں جس سے ہمیں معلوم ہو سکے گا کہ ڈاکٹر خضر یسین کی ہرمینیات کس دائرے میں کس سے اختلاف اور کس کے سائے تلے پناہ لیتی ہے اور کہاں وہ ایک نیا فریم ورک دیتے ہیں۔

1۔زبان و بیان کیا ہے؟

لفظ معنی کے لیے علامت ہے۔اب معنی کا مصداق یا تو خارج میں موجود ہو گا یا ذہن میں تصور کی صورت پایا جائے گا۔پس لفظ کی علامتی دلالت کا مدلول و مصداق خارجی و ذہنی وجود ہیں۔

الفاظ و کلمات کا لغوی ابلاغ تبھی ممکن ہے جب ان کا مدلول خارج میں موجود ہو یا ذہن میں۔

اگر خارجی و ذہنی وجود ہی نہ ہو تو لفظ سے معنی کا ابلاغ نہیں ہو سکے گا۔

پس جس چیز سے مدلول تک پہنچا جا سکے اور جو مدلول کو متعین کرے اسے لسانیات میں "کلمہ یا لفظ" ہی کہا جا سکتا ہے۔

اسی طرح لسانیاتی محاورت کی عمارت کا انحصار دو چیزوں پر ہے:

الف)مشترکہ علامات

ب)سیاق کا پیدا کردہ نظم (مفہوماً ص186،187)

پس"زبان کی حیثیت ایک وسیلے کی ہے"۔(ص129)

## 2۔ مخاطب کا تعیّن

"خطاب کرنے اور سننے کی اہلیت قبل از خطاب ضروری ہے، خطاب کرنے کی اہلیت کے لیے فقط اتنا ہی ضروری نہیں کہ معنی کے ابلاغ کے لیے درست الفاظ کا انتخاب کیا جاسکے،اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مخاطب کے انتخاب میں بھی کوتاہی نہ ہونے پائے "(ص122)

یہ نہایت اہم نکتہ ہے کیونکہ اگر متکلم نے سامعین کے انتخاب میں غلطی کرلی یا مصنف نے تصنیف کے قارئین کا تعین غلط کر لیا تو نتیجہ ابہام و انتشار ہی نکلے گا۔اسی لیے ہم خطباء و مقررین کو دیکھتے ہیں کہ وہ کسی جگہ خطابت و تقریر سے قبل وہاں کے مخاطبین کا تخمینہ ضرور لگاتے ہیں اور اس سلسلہ میں متعلقہ افراد سے استفسار کرتے ہیں۔

**سوال:** کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ایک کلام الگ الگ مخاطبین کے لیے الگ الگ معانی پیش کرے؟

اس کا جواب نفی میں ہے سو آپ لکھتے ہیں:

"الوہی کلام ہو یا غیر الوہی ایک مخاطب کے لیے ایک اور دوسرے مخاطب کے لیے دوسرے معنی رکھتا ہو تو کلام ہونے کے وصف سے عاری ہو جاتا ہے۔"(ص196)

## 3۔ کلام و خطاب کا جواز

"کلام یا خطاب کا جواز جس اصول پر قائم ہوتا ہے وہ اذہان میں ابداع و اخذ معنی کی یکسانی ہے۔"(ص13)

یعنی متکلم کے ذہن میں معنی کا ابداع ہوتا ہے اور اس کے سامع کو وہ معنی اخذ کرنے ہوتے ہیں جس کے درمیان وسیلہ و ذریعہ "زبان" ہوتی ہے۔

متکلم کے شعور میں جو کچھ نمودار ہوتا ہے مخاطب کے شعوری ادراک میں بھی وہی کچھ شعور کا حصہ بن جاتا ہے لہذا ان میں یکسانیت ہے۔ آپ رقمطراز ہیں:

"اگر متن کا مدعا متن کے الفاظ میں مقید ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ متن قاری کے شعور کا عین بن جائے گا۔"(ص146)

کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ متن میں موجود معانی دراصل قاری کے ذہن کی پیداوار ہوتے ہیں؟ تو اس پر ڈاکٹر لکھتے ہیں:

"مغالطہ یہ ہے کہ انسانی ذہن درّاکِ حقیقت ہونے کے بجائے خلاقِ حقیقت ہے"(ص14)

پس انسان کا ذہن حقیقتوں کو درک کرنے والا ہے یہی صائب رویہ ہے نہ کہ یہ ماننا کہ انسانی ذہن حقیقتیں گھڑتا ہے لہذا یہ انسانی ذہن متن سے مصنف کی مراد کو بھی درک کر سکے گا کیونکہ انسانی ذہن ادراک کرنے والا واقع ہوا ہے بلکہ متن ڈاکٹر کے نزدیک کس قدر قابل اعتماد ہے اس جملے سے واضح ہو جاتا ہے:

"متن ایک واقعی حقیقت ہے جو ریاضیاتی اصولوں کی طرح یکساں فہم وادراک کا موضوع ہے، ہر ایک کو اسے اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھنے کے بجائے اس کے مولف و مصنف کے تناظر میں دیکھنا اور سمجھنا ہے۔"(ص210)

4۔ابداعِ معانی اور شعور

کیا ہمارے شعور میں تصورات و معانی پہلے آتے ہیں اور بعد میں ہم ان کی رعایت سے الفاظ و کلمات جوڑتے ہیں؟ یا ہمارا شعور ان معانی کے ساتھ ساتھ الفاظ کو بھی وضع کرتا چلا جاتا ہے؟

اس کا جواب خضر یسین صاحب یوں دیتے ہیں:

"جب ایک ذہن اپنے شعوری ادراک کے نتیجے میں معنی کا ابداع کرتا ہے تو اس کے متوازی الفاظ و کلمات خود بخود وضع ہو چکے ہوتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ معنی کا ابداع تو پہلے وجود میں آجائے اور اس کے اظہار و بیان کے لیے الفاظ و کلمات بعد میں وضع کیے جائیں۔"(ص211)

5۔ابداع کے عمل کی تکرار

معانی مصنف کی ذاتی ملکیت ہوتے ہیں اور الفاظ و کلمات یا تراکیب مشترکہ سرمایہ ہوتا ہے۔

زبان کے کلمات و تراکیب پر کسی کی اجارہ داری نہیں مگر ان کو ایک خاص سیاق میں مرتب کرنے پر مصنف یا متکلم کی اجارہ داری ضرور ہے۔یعنی معانی و تصورات مصنف کے ذاتی ہوتے ہیں بلکل اسی

طرح ان معانی سے پیدا ہونے والا خاص سیاق و نظم بھی مصنف کا ذاتی ہوتا ہے البتہ ان کا اظہار جن کلمات و تراکیب میں ہوتا ہے وہ مشترک سرمایہ ہوتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جب معانی کا ابداع ذہن میں ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی لفظ بھی جنم لیتے ہیں تو کیا ابداع کا عمل تکرار کیا جا سکتا ہے؟ اس پر آپ لکھتے ہیں:

"ذہن الفاظ کا مبدع نہیں بلکہ فقط معانی کا مبدع ہے۔ ابداع کے عمل کی تکرار ممکن نہیں ہے، ابداعِ ثانی محال بالذات ہے، بیان شدہ معانی کا بیانِ ثانی اصلاً ناممکن ہے؛ وجہ یہ ہے کہ اس کام کے لیے از سرِ نو ابداع ناگزیر ہے اور جیسے ہی معانی کا از سرِ نو ابداع ہوگا اس کے ساتھ الفاظ و کلمات نئی ترکیب و ترتیب سے مدوّن ہوں گے۔" (ص187)

6۔ مرکزی دھارا اور سیاقِ کلام

"اظہار و ابلاغ کا ہمیشہ ایک مرکزی دھارا (Mainstream of Expression) ہوتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ بے شمار ذیلی دھارے (Subways of Expression) خودرو نباتات کی طرح چلتے ہیں۔ مرکزی دھارے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک زبان و بیان سے تعلق رکھنے والے انسانی گروہ کی ہر تمنا، ہر خواہش اور ہر آرزو کا انتہائی سادہ اور ٹھوس اظہار و بلاغ ہمہ وقت نہ صرف ممکن رہتا ہے بلکہ عملاً یہی کچھ ہو رہا ہے۔" (ص24)

پس یہی مرکزی دھارا سامنے رہے تو کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی مگر جونہی انسان ذیلی دھاروں کی جانب متوجہ ہوتا ہے تو وہ مدعائے مصنف سے کٹ جاتا ہے اور جن متون میں ذیلی دھاروں ہی کی جانب متوجہ رہنا ہوتا ہے تو وہاں مقصودِ مصنف ابلاغ نہیں ہوتا جیسے جمالیاتی متون وغیرہ۔

اور یہ مرکزی دھارا ہر طرح کی پیچیدگی، تعقید اور تصنع سے پاک ہوتا ہے۔ آگے آپ ایک اہم بات لکھتے ہیں:

"زبان و بیان میں سیاقِ کلام کا اصل یہی مرکزی دھارا ہوتا ہے۔" (ص25)

لہذا کسی لفظ کے مختلف معانی ہیں تو سیاقِ کلام سے اس کے معنی متعین ہو جاتے ہیں۔

7۔ کامیاب متن (Perfect Text)

"کامیاب متن معنی کے ابلاغ کی واضح، غیر مبہم اور سادہ ترین صورت ہوتا ہے۔ کامیاب متن میں پیچیدگی، تہ داری اور تعقیدِ لفظی و معنوی نہیں ہوتیں۔" (ص135)

یہاں کامیاب متن کے دیگر اوصاف تو شاید زیر بحث نہ آئیں مگر یہ قید کہ کامیاب متن "تہ دار" نہیں ہوتا، قابلِ بحث ہے؛ کیونکہ کئی ایک مفسرینِ قرآن کامیاب متن کے اوصاف میں سے ایک وصف یہ قرار دیتے ہیں کہ اس میں تہہ داری اور دقیق باتیں اور مباحث بھی ہوں اور اسی کے پیش نظر تفسیر لکھنے کا جواز بھی پیدا کیا جاتا ہے جبکہ ڈاکٹر خضر یسین اس جواز ہی کو بنیاد سے رد کر رہے ہیں۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ شمس الرحمن فاروقی نے کسی کتاب میں مرزا غالب کے مبہم و مشکل شاعر ہونے پر بات کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر شعر کی تہیں اور پرتوئیں کھولتے ہوئے ایک معنی ہاتھ آئیں تو یہ مشکل شعر کہلائے گا جو کہ عیب ہے لیکن اگر تہہ داری سے مختلف معانی بر آمد ہوں تو یہ مبہم شعر کہلائے گا جو کہ شاعری کا حسن ہے۔

مرحوم فاروقی کی بات تو جمالیاتی متون کے حوالے سے درست ہے کہ شعر مختلف معانی کا حامل ہو تو یہ اس کی خوبی ہے مگر کیا یہ خوبی سنجیدہ متون میں مانی جا سکتی؟ کیا تہہ داری اور دقیق معانی کا ہونا کامیاب متن ہو سکتا؟ آپ لکھتے ہیں:

"علامتی مدارج جیسے جیسے پیچیدہ اور تہہ دار ہوتے ہیں ابلاغ کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے اور جیسے جیسے سادہ اور بلاواسطہ ہوتا ہے ابلاغ کا دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔" (ص199)

علامتی مدارج سے آپ کی مراد ایسا لسانیاتی اظہار جسے پیچیدہ واسطوں سے تشکیل دیا جاتا ہے نہ کہ سادہ اور بلاواسطہ دلالت سے۔

8۔ کیا پیچیدہ کلام بیان بھی ہے؟

اگر کوئی کلام لوگوں کے لیے "بیان" ہے تو اس میں فطری سادگی ہونا چاہیے ورنہ وہ لوگوں کے لیے بیان نہیں رہے گا۔ اسی بات کو سامنے رکھتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

"اظہار وابلاغ کی ایسی پیچیدگی جو کلام کی فطری سادگی غائب کردے، کلام کا حسن قرار دینا تو دور کی بات ہے اسے کلام یا بیان قرار دینا بھی مشکل ہے۔" (ص194)

9۔ حاضر مفہوم (Immediate understanding)

"ذہن کا وظیفہ غور وخوض ہے کسی بھی شے پر غور وخوض کا نتیجہ عامیانہ فہم وفراست سے یقیناً مختلف اور ممتاز ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ لہذا متن کا حاضر مفہوم اور غور وخوض کے بعد پیدا ہونے والا استدلالی مفہوم (Inferential understanding) ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔" (ص136)

یہاں یہ کہا جاسکتا کہ اگر حاضر مفہوم اور استدلالی مفہوم جدا ہوتے بھی ہیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ آپ لکھتے ہیں:

"موافق اور مخالف مفاہیم کی حیثیت کلام کے غیر ملتفت ذیلی دھاروں کی ہے جو ذہن انسانی میں قائم ہوتے ہیں، حاضر مفہوم کے لیے ان ذیلی دھاروں کو حواشی کے طور پر اس لیے قبول کیا جاتا ہے تاکہ حاضر مفہوم ذہن کے مرکزی استحضار سے خارج نہ ہونے پائے۔" (ص90)

پس واضح ہوا کہ حاضر مفہوم کا تحقق اس بات پر منحصر ہے کہ اس کے پہلو بہ پہلو موافق و مخالف مفاہیم موجود رہیں تاکہ انسان کا ذہن مرکزی دھارے کے ساتھ جڑا رہے۔

اب اس پوری تمہید کا نتیجہ یہ نکلا:

"علم بالوحی کے حاضر مفہوم سے جو بھی حواشی وجود میں آتے ہیں وہ صد فی صد درست ہونے کے باوجود علم بالوحی نہیں ہوتے۔" (ص90)

آخر ایسا کیوں ہے؟ کیونکہ یہ دوسرے مفاہیم عقل نظری کے ماخوذ شدہ ہوتے ہیں سوانہیں علم بالوحی قرار نہیں دیا جاسکتا۔اس نکتہ کو دیکھ کر ڈاکٹر خضر یسین کے حوالے سے درج بالا دو باتیں اب اہم اور بنیادی معلوم ہوئی ہوں گی۔

## 10۔کلام اور زمان و مکان

ہم جانتے ہیں کہ ہر بیان کی ایک ترکیب ہوتی ہے جس میں معانی بیان کیے گئے ہوتے ہیں اور اس معنی کا ایک تاثر و تاثیر ہوتی ہے جو عمومی اس وقت کے ماحول پر منحصر ہوتی ہے۔

سو متن نے جن قارئین و مخاطبین پر اپنا تاثر چھوڑنا ہے وہ اگر ماحول کے بدلنے سے فرق کر جائے تو اب الگ ماحول کے مخاطبین کو اس متن کی تفسیر درکار ہو گی جو اس تاثر کو بحال کرے یا مزید شدت سے تاثر چھوڑے۔ لیکن یہ بات الوہی کلام کے لیے درست ہے یا نہیں؟ اس پر ڈاکٹر خضر یسین کہتے ہیں:

"الوہی متن کا بیان جو تاثر پیدا کرتا ہے وہ خود ماحول ساز ہے اور ماحول کی پیداوار نہیں ہے۔" (ص189)

اب زمان و مکان کے طور انسان کا کلام کس نوعیت کا ہوتا ہے؟ آپ لکھتے ہیں :

"انسان کا خطاب مخصوص مواقع پر مخصوص افراد کے لیے مخصوص بیان کی حیثیت رکھتا ہے" (ص229)

لیکن الوہی کلام کو زمان و مکان سے ماوراء ہونا چاہیے:

"اگرالوہی کلام حقیقی امر ہے تو یہ اس کی ذاتی فطرت ہے کہ وہ انسان کو اپنا مخاطب بناتے ہوئے زمان و مکان کے متعلقات یعنی تمدن اور تمدنی مظاہر کی اصلاح کرے نہ کہ تمدن و تمدنی مظاہر کے بطن سے پھوٹنے والا ایک مظہر بن کر رہ جائے۔" (ص129)

## 11۔ وجودی و ہیئتی منصب

ہر کلام کے دو منصب ہوتے ہیں :

الف: وجودی منصب جیسے انسانی ہونا یا الوہی ہونا

ب: ہیئتی منصب جیسے نظم یا نثر وغیرہ ہونا

ہم جانتے ہیں کہ وجودی منصب تبدیل نہیں ہو سکتا، یہ کسی طور بھی ممکن نہیں کہ انسانی کلام کو الوہی بنایا جاسکے یا الوہی کلام کو انسانی بنایا جاسکے۔ البتہ ہیئتی منصب بدلتا ہے جیسے نظم کو نثر اور نثر کو نظم میں ڈھالا جاسکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کے ہیئتی منصب میں تبدیلی ممکن ہے؟ آپ رقمطراز ہیں:

"عربی ادب میں قرآنی ہیئتِ بیان ایک مستقل ہیئت ہے جسے نظم کہا جاسکتا ہے اور نہ نثر کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔" (ص217)

پس قرآن کے وجودی منصب کے ساتھ ساتھ اس کے ہیئتی منصب کو بھی تبدیل کرنا نا ممکن ہے۔

## نتیجہ

اگر ہم مذکورہ نکات پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر خضر یسین کی ہرمینیاتی فکر دو چیزوں پر استوار ہے:

1۔ایک سطح وہ ہے جو کلاسیکی ہرمینیات یا یوں کہیے کہ قدیم علمِ تشریح و تفہیم، سے مماثلت رکھتی ہے:

الف۔ متن کا وسیلہ ہونا

ب۔ مصنف کی مراد تک رسائی

ج۔اصل غلط فہمی کا نہ ہونا

د۔ سیاق کی اہمیت وغیرہ۔

یہ تمام عناصر ہمیں قدیم روایت میں بھی ملتے ہیں۔

2۔ دوسری سطح ان تصورات سے عبارت ہے جو آپ کی ہرمینیاتی فکر کا اختصاصی پہلو ہیں:

الف)اہمیت مرکزی دھارا کی ہے لہذا ذیلی دھاروں سے اعراض کیا جائے گا

ب)مصنف کے مقصود تک پہنچنے کے لیے محض حاضر مفہوم کا کافی ہونا حتیٰ اگر مفہومِ موافق و مخالف قرآن سے ماخوذ بھی کیا جائے تو بھی وہ انسانی علم شمار ہو گا علم بالوحی نہیں کہلایا جائے گا

ج)کامیاب متن کو تہہ دار نہیں ہونا چاہیے

د)ابداع کی تکرار کا ناممکن ہونا

ھ)پھر قرآن کو وجودی و ہیئتی منصب میں تقسیم کر کے یہ بتانا کہ دونوں صورتوں میں قرآن کے کلام کو دوسرا اور ژن نہیں دیا جاسکتا اور تفسیر، ترجمہ و خلاصہ کو رد کرنا۔

ہمارے خیال میں یہ تمام موارد آپ کی ہرمینیاتی فکر کی جداگانہ شناخت عطا کرتے ہیں۔

**التفات**: یہ مضمون ڈاکٹر خضر یسین کی فکر سے اتفاق یا اختلاف کے اظہار کے لیے نہیں لکھا گیا بلکہ اس کا مقصد ایک دقیق مفکر کی فکر کے ایک اہم پہلو کو اجاگر کرنا ہے؛ تا کہ ان کی علمی کاوشوں کو سراہتے ہوئے ان پر سنجیدہ نقد و نظر کا دروازہ کھلے اور علم و شعور کا سفر آگے بڑھتا رہے۔

**ماخذ: علم تفسیر: تنقید و تنقیح**

والسلام